باب۔ ۱۲

ترجمہ
فص شعیبیہ
حکمت قلبیہ

معلوم ہو کہ عارف باللہ کا قلب اللہ کی رحمت سے موجود ہوا ہے، مخلوق ہوا ہے۔ مگر قلبِ عارف میں رحمتِ الٰہی سے بھی زیادہ وسعت ہے۔ کیوں کہ قلبِ عارف میں حق جل جلالہٗ کی بھی سمائی ہے۔۔۔ (حدیث قدسی) لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسنع قلب عبدی المومن، [(یعنی) نہ زمین مجھے سماتی ہے نہ آسمان مگر مومن کا دل مجھے سماتا ہے (کتب الصوفیہ)] اس پر شاہد ہے۔ رحمتِ الٰہی میں حق جل جلالہٗ کی سمائی نہیں، کیوں کہ خدا "راحم" ہے یعنی دوسروں پر رحم کرنے والا ہے۔ اس پر کوئی رحم نہیں کرتا نہ (وہ) خود اپنے آپ پر رحم کرتا ہے۔ پس ذاتِ حق پر رحمت کا کوئی حکم، کوئی اثر نہیں۔ اس لیے کہ وہ کامل و مکمل ہے۔ یہ خیال علمائے ظاہر کا ہے۔

مگر زبانِ خصوص کا کیا اشارہ ہے، یعنی صوفیہ کیا کہتے ہیں۔؟ اللہ نے بزبان نبی کریمؐ اپنے لیے نفس {بفتحتین (یعنی دو زبر کے ساتھ)} ثابت کیا ہے۔ انی اجد نفس الرحمٰن من جانب الیمن، (یعنی) رحمٰن کی خوشبو یمن کی طرف سے پاتا ہوں (رواہ احمد والطبرانی)، اس پر دال ہے (ثبوت ہے)۔ نفس یعنی سانس لینے سے تنفس یعنی اضطراب رفع ہوتا ہے (اور بے قراری دور ہوتی ہے)۔

اسمائے الٰہیہ مفہوم کے لحاظ سے بعد انتزاع باہم غیر ہیں۔ مگر منشا کے لحاظ سے، مسمّیٰ کے لحاظ سے، منتزع عنہ کے لحاظ سے ایک ہی ذاتِ حقہ سے نمایاں ہے۔ ان سب کی ذات ایک ہی تو ہے، " حق جل جلالہٗ"۔ یہ بھی تم کو معلوم ہے کہ اسمائے الٰہیہ، حقائق کونیہ کے مظاہر کے طالب ہیں تاکہ ان پر اپنا پرتو ڈالیں۔ ان کو پیدا کریں اور اپنے کمالات کا تماشہ دکھائیں۔ وہ حقائق کیا ہیں۔۔؟ (یہ) عالم ہی تو ہے۔ لہٰذا الوہیت، مالوہ (یعنی عبد و عابد) کو طلب کرتی ہے، اور ربوبیت، مربوب کو۔ اگر اسمائے الٰہیہ طالبِ حقائق کونیہ اور ماہیاتِ ممکنہ و مخلوقات نہ ہوتے {خواہ ثبوت میں ہو خواہ وجود میں، خواہ علم میں ہو خواہ خارج میں، خواہ ذہن میں ہو خواہ شہادت میں} تو اسمائے الٰہیہ ظاہر ہی نہ ہوتے۔ ان کے جلوے نمایاں ہی نہ ہوتے۔

حق تعالیٰ اپنی ذاتِ پاک (اور) شانِ احدیت کے لحاظ سے تو،إِنَّ اللَّـهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ہے،{یعنی} اللہ تمام جہانوں سے مستغنی ہے،(العنکبوت:٦)، بے پرواہ ہے۔ مگر ربوبیت کو یہ بے نیازی نہیں، کیوں کہ وہ صفتِ اضافی ہے۔ رب کو مربوب چاہیے (اور) آقا کو غلام درکار ہے۔

نہ نیاز تھا تو نہ ناز تھا نہ درِ کمال ہی باز تھا
مری جان جاں تھا نہاں رہا ترا ناز میرے نیاز میں

لہٰذا امر الٰہی دو وجہ میں منحصر و دائر ہے۔ ربوبیت کے لحاظ سے طالبِ عالم اور ذات کے لحاظ سے عالم سے مستغنی۔ مگر حقیقت میں، نظر انصاف میں ربوبیت کا منشا، منتزع عنہ ذاتِ حق ہی ہے۔

چوں کہ مختلف نسبتوں کی وجہ سے مختلف حکم لگائے گئے ہیں، لہٰذا حدیث شریف میں وارد ہوا کہ "اللہ تعالیٰ نے خود کو بندوں پر رؤف، لطیف، رحمٰن، رحیم (اور) کریم فرمایا"۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے شانِ ربوبیت کی طلبِ مظاہر کے شوق کو پورا کر کے تسکین دی۔ وہ اپنے نفسِ رحمانی سے جس سے ہر آن، ہر لحظہ عطاے وجود کرتا ہے، عالم کو ایجاد کیا۔ عالم کو حقیقت و شانِ ربوبیت نیز تمام اسماے الٰہیہ طلب کرتے ہیں کہ ان پر اپنا پرتو ڈال کر اپنے کمالات ظاہر کریں۔ اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ رحمت میں تمام خلق کی وسعت ہے بلکہ اسما کے لحاظ سے خود حق کو لینے کی وسعت ہے۔ پس رحمتِ الٰہی قلبِ عارف سے زیادہ وسیع ہے۔ یا اس کے برابر ہے۔

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ تجلی کے وقت مختلف صورتوں میں بدلتا رہتا ہے۔ وہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ہے[یعنی وہ) ہر آن ایک نئی شان سے جلوہ گر ہے،(الرحمٰن:٢٩)]۔

جب دل میں حق آتا ہے تو باطل کی یعنی مخلوقات کی گنجائش نہیں رہتی۔ گویا حق تعالیٰ دلِ عارف کو اپنی ذات سے بھر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب عارف، حق کو اس کی تجلی کے وقت دیکھتا ہے تو اس کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں کہ غیر حق کو دیکھے۔

قلبِ عارف کی کتنی وسعت ہے (اس کے لیے) بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں، "اگر عرش اور عرش کے دائرے میں جو کچھ ہے دس کروڑ بار دلِ عارف کے گوشے میں آجائے تو اس کو احساس بھی نہ ہوگا"۔۔۔ اس معنیٰ میں جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں، "حادث جب قدیم کے نزدیک ہوتا ہے (تو) حادث کا پتا بھی نہیں رہتا۔ وہ قلب جو قدیم کو سمالے بھلا حادث کو کیوں کر موجود پائے گا"۔

چوں کہ حق جل مجدہ کے تجلیات انواع انواع کی صورتوں میں ہوتے ہیں لہٰذا قلب بھی {مطابق تجلیِ الٰہی کے جو اس میں پرتو افگن ہو} کبھی وسیع ہوتا ہے، کبھی تنگ۔ قلبِ عارف کا کوئی حصہ اس تجلی سے خالی

نہیں رہتا۔ عارف یا انسانِ کامل کا قلب بمنزلہ انگشتری (انگوٹھی) کے اس حصے کے ہوتا ہے جس میں نگینہ جڑا جاتا ہے، کہ نگینے سے کوئی حصہ زائد نہیں ہوتا۔۔ بلکہ جس قدر نگینہ، اسی قدر اس کا محل۔ نگینہ گول ہو تو اس کا محل بھی گول، مربع تو مربع، مسدس تو مسدس، (اور) مثمن تو مثمن۔ غرض کہ جیسی شکل نگینے کی ہو گی ویسی ہی شکل اس کے محل کی ہو گی۔ یہ حکم بعض عارفین کے اِس قول کے خلاف ہے کہ حق تعالیٰ بقدر استعدادِ عبد تجلی فرماتا ہے۔ کیوں کہ عبد اسی صورت کے مطابق ظاہر ہو گا جو اس میں جلوہ فگن ہو گا۔

بقدر وسع آئینہ، ہوا آئینہ گر ظاہر
بنا کر آئینہ خانہ وہی محو تماشا ہے
یہ جو صورت ہے مری صورتِ جاناں ہے یہی

اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دو تجلیاں ہیں:

(۱) تجلیِ غیبی: یعنی ذاتِ مقدسہ سے علم میں اعیان ثابتہ کا ظہور {جس کو فیضِ اقدس کہتے ہیں}۔ اس میں استعداد محل، تابع تجلیِ عملی ہوتی ہے۔

(۲) تجلیِ شہادی: عالم شہادت و خلق میں {جس کو فیضِ مقدس کہتے ہیں}۔ عالم خلق میں تجلیِ اسماو صفات ہوتی ہے اور وہ تابع محل یعنی تابع استعداد اعیان ثابتہ ہوتی ہے۔ (گویا) جیسی استعداد اعیان ثابتہ ہوتی ہے ویسی ہی تجلی ہوتی ہے۔ ویسی ہی چیز نمودار ہوتی ہے۔ اور یہی معنیٰ ہیں اس قول کے (کہ) علم تابعِ معلوم اور تجلی تابعِ علم اور ظہورِ تجلی (ہوتی ہے)۔

تجلیِ ذاتی و غیبی و فیضِ اقدس سے عین ثابتہ اور قلبِ عارف کو استعداد ملتی ہے۔ اس تجلی کی حقیقت و اصل کیا ہے۔۔؟ وہی ہویتِ حقہ ذات الٰہیہ ہے جس کی نفس سے تعبیر کی گئی ہے۔ یہ تجلیِ غیبی، لایزال و ابدی و قدیم، حق تعالیٰ کے لیے ہے۔ بہر حال قلبِ عارف تجلیِ حق کو دیکھتا ہے۔ پھر اپنی استعدادِ کلّی کے موافق ہی تجلیِ الٰہی اور صورت کو دیکھتا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔

وہی ہر شئے کو استعدادِ کلّی عطا کرتا ہے، پھر اس کے ظہور و استعداد جزئیہ کے مطابق تجلیاتِ اسمائیہ کی طرف راستہ دکھاتا ہے۔ (اس کے بعد) اپنے اور اپنے عبد کے درمیان سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ عبد اپنے رب کو دیکھتا ہے مگر کس طرح۔۔؟ حق تعالیٰ کے متعلق اپنے اعتقاد کے موافق۔ یہ تجلی کیا ہے، گویا اسی کا اعتقاد ہے۔ قلب یا عین ثابتہ اپنے اعتقاد، اپنے علم کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا۔ پس حق جو اعتقاد میں ظاہر ہوتا ہے قلب میں اسی کی وسعت ہوتی ہے۔ ویسی ہی اس پر تجلی ہوتی ہے۔ ویسا ہی اس کو علم ہوتا ہے۔ بہر حال جیسا عقیدہ ویسا شہود۔

یہ بات مخفی نہیں کہ اعتقادات مختلف ہوتے ہیں۔ جو شخص حق تعالیٰ کو اپنے اعتقادِ خاص میں مقید کر دیتا ہے تو وقتِ تجلی، اگر تجلی اس کے اعتقاد کے موافق نہ ہو، تو (وہ) انکار کر بیٹھتا ہے، اور موافق ہو تو اقرار

کرتا ہے۔ یہ شخص ،نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ[(یعنی)ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے ،(النساء:۱۵۰)] میں داخل ہوتا ہے۔۔۔(اور) جو حق تعالیٰ کو وجودِ مطلق جانتا ہے اور کسی اعتقاد یا ظہورِ خاص میں مقید نہیں کرتا(تو ایسا شخص) حق تعالیٰ جیسی صورتیں بدلتا جائے اقرار ہی کرتا ہے اور اپنی ذات و عین سے جیسی تجلی اس پر ہوئی ہے نمایاں کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ غیر متناہی طور پر جاری رہتا ہے۔

طلب تمھاری بے حد ہو
لا تحصیٰ جب جلوت ہے

تجلیاتِ الٰہی کسی ایک حد پر ٹھیر نہیں جاتے۔ وہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ہے،[(یعنی)وہ ہر وقت نئی شان میں جلوہ گر ہے،(الرحمٰن:۲۹)]۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے متعلق علم بھی عارفین کے پاس کسی حد پر ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر درجۂ علم پر طالبِ زیادت رہتا ہے۔ مدینتہ العلم صلی اللہ علیہ وسلم پکارتے ہیں، رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا،رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا،رَبِّ زِدْنِي عِلْمً۔ (یعنی)خدایا مجھے علم دیتا چلا جا،(طٰہٰ:۱۱۴)۔۔۔نہ عارف کی طلب کی انتہا،نہ متجلی کی تجلیات کی انتہا۔ تناہی(یا محدودیت)طرفین کے پاس نہیں پھٹکتی۔

یہ تقریر تو اس وقت ہے جب رب وعبد کا اعتبار کیا جائے اور حق و خلق کہا جائے۔ جب ذاتِ مطلق پر نظر ڈالی جائے اور حدیث کے اس حصے کو دیکھا جائے کہ "اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے" (صحيح البخاري، فتح الباري، تحفة الأحوذي)،(تو)اس کے سوا اور کوئی قوت اور محلِ قوت یعنی اعضا کو دیکھے، تو رب وعبد کا اعتبار نہیں رہتا۔ موحد کی نظر میں حق ہی حق ہے اور عبد، خیالی ہے۔ غافل کی نظر میں عبد ہی عبد ہے(اور)رب، خیالی ہے۔ کامل کی نظر میں ایک لحاظ سے رب ہے اور ایک لحاظ سے عبد ہے۔ ذاتِ حقیقی ایک ہی ہے۔ وہی تجلی کرنے والا ہے۔ وہی تجلی قبول کرنے والا ہے۔ وہی متجلی ہے، وہی متجلی لہٗ ہے۔

اے عارف! حق جل مجدہ کی بھی کیا عجیب و غریب شان ہے۔ اس کی ہویت و ذات کے لحاظ سے بھی اور حقائق اسمائے حسنیٰ کی عالم کی طرف نسبت سے بھی۔

وہی بے چوں باچوں آیا
وہی صورت ہے وہی معنیٰ

فمن ثمّه وما ثمّه وعين ثم هو ثمّه

کہاں ہیں ذوی عقول(انسان)، کدھر ہیں غیر ذوی عقول(حیوان)جو عین یعنی متعین و مقید ہے۔ وہی نفس الامر میں، خارج میں ذات وجود مطلق ہے۔

فمن قد عمّه خصّه ومن قد خصّه عمّه

جو عام ہے وہی ظہور کے لحاظ سے خاص ہے، جو خاص ہے وہی منشاے حقیقت کے لحاظ سے عام ہے

فما عين سوى عين فنور عينه ظلمه

ذات حقہ کے سوا ذوات باطلہ یعنی ممکنات موجود بالذات ہی کب ہیں، ذات حقہ اپنی شدتِ ظہور نور سے شپرّہ چشم (یا تعصب کی نگاہ) میں ظلمات معلوم ہوتی ہے، نا قابل ادراک ہے

فمن يغفل عن هٰذا يجد في نفسه غمّه

جو ان اعتبارات سے غافل ہے اس کی آنکھوں کے سامنے گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں

ولا يعرف ما قلنا سوىٰ عبد له همّه

ہماری ان باتوں کو وہی بندہ سمجھے گا جو صاحبِ ہمت ہو، جس کے دل میں قوت ہو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ (یعنی) اس میں یاد دہانی ہے اُس کے لیے جس کے سینے میں دلِ دانا ہو، (ق:۳۷)۔ کیوں کہ وہ انواع صور وصفات میں ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کو عقل ہو، کیوں کہ عقل زنجیر پا ہے۔ وہ ایک صفت میں پابند کر دیتی ہے۔ حقیقت تو نفس الامر میں، ایک صفت میں محصور رہنے سے، ابا وانکار کر دیتی ہے۔

یہ صاحبانِ عقل جامد (یعنی تنگ ذہن لوگوں) کے لیے یاد دہانی نہیں ہے۔ عقلا کے اعتقادات خاصہ وعقائد، جزئیہ ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہے ایک دوسرے کو کافر کہنا۔ ایک دوسرے پر لعنت کا دروازہ کھولنا۔ ایسوں کا نہ کوئی یار ہے نہ مدد گار۔ ایک کا مصنوعی رب دوسرے کے خیالی رب پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ وہ خود اپنے خیالی رب کی طرف سے مدافعت کرتا ہے۔ مگر اس کا رب اس کی طرف سے مدافعت نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ مصنوعی ہے، حقیقی وواقعی نہیں۔۔۔ مصنوع، صانع کی کیا مدد کرے گا۔۔! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّـهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ، (یعنی) خدا کے سوا دوسروں کو رب انھوں نے اس لیے بنایا تھا کہ شاید ان کی کچھ مدد کی جاتی۔ یہ مصنوعی دیوتا کیا مدد کر سکتے ہیں، بلکہ خود اپنے دیوتاؤں کی طرف سے لڑنے کے لیے حاضر لشکر ہیں، (یٰس:۷۴ اور ۷۵)۔

یہ صاحبِ اعتقاد، اپنے اعتقادی وخیالی رب کی طرف سے مدافعت کرتا ہے اور اس کا خیالی معبود خود اس کے کام نہیں آتا۔ ان رَد وکد کرنے والوں (یعنی حجت کرنے والوں) کے خیالی دیوتا ایک دوسرے کے پجاری پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں۔۔۔ بہر حال نہ اِن کا کوئی مدد گار ہے، نہ اُن کا یادر ویار۔

حق تعالیٰ نے ہر اُن الٰہ سے جو شخصی اعتقاد ومفرد خیال کے مطابق ہیں، نصرت کی نفی کی ہے۔ البتہ ہر طرح کی تجلیات کا اعتقاد رکھنے والا، منصور ہے۔ اور ہر طرح کی تجلیات کرنے والا رب، ناصر ہے۔ عارف کے پاس حق ہر طرح معلوم ومعروف ہے کیوں کہ علم ہی شہود ہوتا ہے۔ ایسے لوگ حق تعالیٰ جو تجلی فرمائے، خواہ

اعتقادی ہو خواہ شہودی، کسی سے انکار نہیں کرتے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے، لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ {یعنی} جو دلِ دانا رکھتا ہے، (ق:۳۷)، متقلب و متغیر قلب رکھتا ہے اور حق تعالیٰ کے عوالم میں شکلوں و صورتوں کے بدلنے کو پہچانتا ہے۔

پس عارف نے اپنی ذات سے ذاتِ حق کو پہچانا۔ کیوں کہ عارف کی ذات، ذاتِ حق سے جدا ہی کب ہے۔! دنیا میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہونے والا ہے بغیر ذاتِ حق و ہویت الٰہیہ کے موجود ہی کب ہو سکتا ہے۔! بلکہ ذواتِ عالم، باعتبار منتزع عنہ کے، عین ہویتِ حق ہیں، حقیقت کے (اور) واقع کے۔ پس حق تعالیٰ عارف و عالم کے ضمن میں مقر (یعنی ماننے والا) ہے اور جاہل کے ضمن میں دوسری صورت (اور) دوسری تجلی کا خود ہی منکر ہے۔ غرض کہ جو شخص ہر طرح سے مقام جمع (یا احدیت) میں تجلی و شہود کو پہچانتا ہے، وہ قلبِ متقلب (اور لچکدار دل) رکھتا ہے۔ اس کو علم صحیح ہے۔ تقلبِ حق کی معرفت ہے۔ یہی معنیٰ تو ہیں لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ کے۔ ایسے شخص کا، جیسے جیسے تجلیات بدلتے رہتے ہیں، اعتقاد بدلتا رہتا ہے۔

جو صاحبِ ایمان ہیں (وہ) انبیا و رسل جو کچھ فرماتے ہیں اس کی تقلید کرتے ہیں، نہ کہ فکر و عقل کے بندے ہیں کہ جو اخبارِ رُسل کی دلائل عقلیہ کے مطابق تاویل کرتے ہیں۔ ان انبیا و رسل کے مقلدین کے متعلق ہی اللہ کی مراد ہے (کہ)، أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ، (یعنی) جس نے کان جھکایا اور اس کا دل حاضر ہے، (ق:۳۷)۔ جو کان لگا کر سنتے ہیں، پوری توجہ سے سنتے ہیں۔۔۔ اس آیتِ شریفہ میں عالم مثال و خیال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اس کے استعمال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مرتبۂ احسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ عبادت کے وقت تم ایسا سمجھو گویا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہو، نیز اللہ مصلی و نمازی کے قبلے کے درمیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص شہودِ مثالی اور رویت سے ممتاز ہے۔

جو شخص صاحبِ نظر و فکر کا مقلد ہے اور ان کے نظریات سے مقید ہوتا ہے وہ أَلْقَى السَّمْعَ کا مصداق نہیں۔ کیوں کہ جو سمع قبول سے متوجہ ہوتا ہے وہ ضرور شرفِ دیدار سے بھی مشرف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ساتھ ہی وَهُوَ شَهِيدٌ بھی لگا ہوا ہے۔ جب بندۂ عقل، صاحبِ شہود نہیں تو اس آیت کا مصداق بھی نہیں۔ یہ تو ان لوگوں میں داخل ہے جو، إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا، {یعنی} متبوع تابعین سے بیزار ہوں گے، بری ہوں گے، (البقرۃ:۱۶۶)۔ تم کو یہ معلوم ہی ہے کہ انبیا اپنے تابعین سے بری و بیزار نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ ان کی تعلیم عینِ خدا کی تعلیم تھی۔۔۔ میرے پیارے! میں نے اس حکمت قلبیہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کا یقین رکھو۔ اس کو دل نشین کر لو۔

اس حکمت قلبیہ کو شعیب علیہ السلام سے کیوں منسوب کیا۔؟ صرف لفظی و اشتقاقی (یعنی ماخوذ کیے جانے کی) مناسبت سے۔ کیوں کہ شعیب، شعبہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں شاخ۔ تقلبِ قلبی (یا کسی

بھی نکتہ پر دل کے الٹ پلٹ ہوسکنے) کی بھی بہت سی شاخیں ہیں جو ناقابل حصر (اور لامحدود) ہیں۔ اس لیے کہ ہر ایک اعتقاد ایک خاص شعبہ رکھتا ہے۔ پس اعتقادات کی شاخیں ہی شاخیں ہیں۔ جب پردہ اٹھ جائے گا تو حق تعالیٰ کا ظہور اس کے اعتقاد کے لحاظ سے ہوگا۔۔۔ جیسا عقیدہ ویسا شہود۔۔۔ بعض عقیدے احکام لگاتے ہیں جو خلافِ حق رہتے ہیں۔ غلط اور غیر واقعی رہتے ہیں۔ حجاب اٹھنے کے بعد خلافِ عقیدہ نکلتے ہیں۔ ان پر یہ آیت صادق آتی ہے، وَبَدَا لَهُم مِّنَ اللَّـهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ،[(یعنی) اور اللہ کی طرف سے ایسا معاملہ پیش آئے گا کہ جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے تھے، (الزمر:۴۷)]۔

اکثر اختلافات عقائد و احکام شرعی میں ہیں۔ مثلاً معتزلی (ایک اسلامی فرقے) کا اللہ تعالیٰ کے متعلق عقیدہ ہے کہ بندۂ گناہ گار اگر بے توبہ مر جائے تو اس پر وعیدِ حق (اور) حکم سزا نافذ ہوگا، یعنی وہ بخشا نہ جائے گا، سزایاب ہوگا۔ فرض کرو کہ ایک گناہ گار کا خیال تھا کہ میں ایسا گناہ گار ہوں کہ قابلِ عفو نہیں ہوں اور وہ بے توبہ مر جائے اور عند اللہ وہ قابلِ رحم تھا اور عنایتِ ازلی سابق و جاری تھی کہ عقوبت سزا نہ دی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کو غفور و رحیم پائے گا۔ گویا اس کے حق میں خدا کا برتاؤ خلافِ توقع بہتر ہوگا۔

مقلدِ پیغمبر، جو پیغمبر کی تصدیق میں اجمالی علم صحیح رکھتا ہے، اس کے عقیدے کے خلاف ذات و ہویتِ حق کا نکلنا بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بعض بندے اپنا راسخ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔ جب حجاب اٹھ جائے گا اور اپنے عقیدے کی صورت دیکھے گا اور وہ صورتِ حق ہوگی جس کا وہ معتقد تھا۔ پھر عقدے اور گرہیں کھل جائیں گی، موانع دور ہوں گے، تو اگلے طریقے پر اعتقاد نہ رہے گا۔ بلکہ علم شہودی ہوگا، قطعی و یقینی ہوگا۔ عین الیقین ہوگا جب بروز قیامت بندوں کی نظر تیز ہو جائے گی۔ دیدار کے وقت (آنکھ) چندھیانہ جائے گی، خیرہ نہ ہوگی۔ اس کے عقیدے کے سوا دوسری صورتوں میں بھی تجلیات بدلتے جائیں گے۔ کیوں کہ "التجلی لا یتکور" یعنی تجلی میں تکرار نہیں۔ ہر وقت نئی ہی شان ہے، تو گو اس کے عقیدے کے خلاف ہوگا مگر معلوم و معروف ہوگا۔۔۔ وہ شخص اس تجلی کو پہچان لے گا تو ہویت و ذات کے لحاظ سے بھی وَبَدَا لَهُم مِّنَ اللَّـهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ صادق آئے گا۔ اس لیے کہ قبلِ کشف و عطا و رفع، حجاب اعتقاد مفید رکھتا تھا۔ مگر بعد کشف حجاب، مطلق اعتقاد ہو جائے گا۔

مرنے کے بعد معارف الٰہیہ میں ترقی کو ہم نے ہماری کتاب "تجلیات" میں بیان کیا ہے۔ جہاں اس کا ذکر ہے کہ ہم نے عالم کشف میں کس کس عارف سے ملاقات کی۔ اور ہم نے اس مسئلے میں کیا مفید تقریر کی جو ان کے علم میں نہ تھی۔

یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ انسان تجدد امثال کے موافق دائماً ترقی میں ہے۔

ہر دم ہے تازہ فتنہ برپا تری گلی میں

بات یہ ہے کہ حجاب ایسا لطیف ورقیق ہے، ایسا ملتا جلتا اور متشابہ الصور (یا دیکھنے میں اتنا ایک جیسا) ہے کہ وہ ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ قولہ تعالیٰ،وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا،(یعنی) جنتیوں کو رزق ملے گا، وہ باہم ملتا جلتا رہے گا،(البقرۃ:۲۵)۔ ایک صورت دوسری صورت سے عین نہ ہوگی۔ کیوں کہ شبہیں عارف کے پاس مابہ الامتیاز و فرق کی وجہ سے جدا جدا ہیں۔ صاحبِ تحقیق، مابہ الاشتراک (مشترک) اور مابہ الامتیاز (مختلف) دونوں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ کثرت، وحدت میں ہے، جیسے اسمائے الٰہیہ۔ باوجود یہ کہ ان کے حقائق مختلف ہیں، اُن پر مختلف آثار مرتب ہوتے ہیں، ان کے مفہومات جدا ہیں، وہ عقل میں کثیر ہیں، مگر ہیں ایک ذات میں، ایک عین میں۔ یہی وجہ ہے کہ کہتے ہیں کہ اسمائے الٰہیہ لا غیر ہیں اور لا عین ہیں۔ یعنی ان کے مفہومات جدا جدا ہیں اور ذات ایک ہے۔ یہ کثرت ذاتِ واحد میں مشہود و معلوم ہوتی ہے۔ ذرا ہیولیٰ پر غور کرو۔ یہ مختلف صورتیں کس پر وارد ہوتی ہیں۔ ہیولیٰ پر۔۔۔ ہر ہر حدِ تعریف میں کون داخل ہے۔۔؟ ہیولیٰ۔ کیا تمام اختلافات کا محل مابہ الاشتراک ہیولیٰ نہیں ہے۔ کیا ان سب میں ہیولیٰ مشترک نہیں ہے۔ بے شک ہے۔ اس طرح تمام مشہودات کا مرجع، ذاتِ حق ہے۔

جس نے اس طرح معرفت حاصل کی یعنی اصل و حقیقت، ذاتِ حق کو سمجھا، اور سارے عالم اور خود اپنے کو تجلی گاہِ حق سمجھا اور معلوم الٰہی پر پرتو وجودِ مطلق دیکھا، تو بے شک اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ اس کی معرفت سے سرفراز ہوا اور "مَن عرف" کو پایا۔ کیوں کہ اللہ تعالی نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ بلکہ عبد، منشا کے لحاظ سے عینِ رب، ہویت حق اور حقیقتِ مطلق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علما و حکما میں سے کسی نے معرفت و حقیقتِ نفس کو حاصل نہ کیا مگر حق پرستوں، علمائے الٰہیین، پیغمبروں اور اکابر صوفیہ نے حقیقتِ نفس کو دریافت کر لیا۔ اربابِ نظر، اصحابِ فکر، قدما و متکلمین سے، جو نفس اور اس کی حقیقت میں گفتگو کرتے ہیں، ان میں سے کسی نے بھی حقیقتِ نفس کو نہ پایا۔ اور نہ ان میں سے کسی کو اس کا پتا لگا۔ کیا کرتے۔! نظر فکری ہرگز ان کو اس کا پتا ہی نہیں دیتی۔ جو نفس کی حقیقت، نظر فکری سے حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ وَرم کو موٹاپا جانتا ہے۔ بغیر آگ کے پھونکتا جاتا ہے۔ ناگزیر ان کی مصداق، ان لوگوں کی ہوگئی جن کی سعی دنیا کی زندگی میں اکارت گئی۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ جن کی طلب بے راہ ہے، وہ تحقیق سے کب آگاہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے، ایک حصے کے حق میں، بلکہ اکثر عالم کے حق میں کیا خوب فرمایا ہے، بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ، (یعنی) وہ لوگ خلقِ جدید اور تازہ پیدائش سے شک میں پڑ گئے ہیں، (ق:۱۵)۔ وہ نہیں سمجھتے کہ وہ ہر آن ہر دم 'تجدد امثال' کی وجہ سے ایک نئے رنگ میں ہیں۔

اشاعرہ (اشعری فرقہ)، بعض موجودات یعنی اعراض (یا بعض علامات) میں ہر دم تجدد کے قائل ہیں۔ اور سوفسطائیہ (سوفسطائی فرقہ)، جس کو حسبانیہ بھی کہتے ہیں، سارے عالم میں ہر آن تجدد کے قائل ہیں۔ ان کو تمام عقلا اور اہل نظر نے جاہل بنایا، مگر دونوں فریق خطا پر ہیں۔

حسبانیہ یعنی سوفسطائیہ کی خطا یہ ہے کہ وہ عالم کو ہر آن ہر لحظہ متغیر جانتے ہیں اور تمام عالم کو اعراض (وعلامات) سمجھتے ہیں۔ غیر قائم بالذات سمجھتے ہیں، مگر افسوس کہ ان کو ذاتِ حقہ کا پتا نہ ملا۔ انھوں نے یہ نہ سمجھا کہ ان تغیرات کو قبول کرنے والی ایک ذاتِ حقہ ہے۔ وہ ذات نہ ہوتی تو یہ اعراض کیوں کر قائم رہتے۔ وجود بالعرض بغیر وجود بالذات کے ممکن نہیں۔ صور و اشکال، وجود میں ذات کے محتاج ہیں۔ ذات تعقل اور سمجھ میں آنے میں صور و اشکال کی محتاج ہیں۔ اتنا سمجھتے تو وہ تجدد امثال و تغیر عالم میں درجۂ تحقیق کو پہنچتے۔

اشاعرہ کی خطا یہ ہے کہ عالم میں بعض کو عرض و غیر مستقل (اور) بعض کو جوہر بالذات سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے سوا کون بالذات ہے؟ عالم میں جتنی چیزیں ہیں اعراض ہیں، غیر قائم بالذات ہیں۔ عالم ہر دم ہر لحظہ متغیر و متبدل ہے۔ عرض کی شان سے ہے۔ دو آن، دو زمان میں باقی نہیں رہتا۔

ذرا اشیا کی تعریف تو کرو۔ ان تعریفات و حدود میں اعراض کے سوا ہے کیا؟ انسان کیا ہے۔۔۔؟ حیوانِ ناطق۔ حیوانیت و نطق دونوں عرض ہیں۔ حیوان کیا (ہے)۔۔۔؟ جسم نامی حساس نمو۔ (یہ) عرض نہیں تو اور کیا ہے۔ جسم کیا ہے۔۔۔؟ جوہر، قابل الابعاد المثلثہ، {قابل البعاد ثلث ہونا} (یعنی سہ جہتی ہونا) یعنی طول (لمبائی)، عرض (چوڑائی) اور عمق (گہرائی) رکھنا۔ یہ سب کیا ہے۔ عرض ہی عرض ہے۔۔۔ ایک بالذات چیز، مستقل ذات کون ہے۔۔۔؟ حق ہے حق۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔

یہ سب اعراض جو تعریفات میں واقع ہیں، ذاتِ حقہ ہی سے قائم ہیں۔ یہ ذات بالذات جوہرِ اصلی ہی اپنی حقیقت کے لحاظ سے عرض ہے۔ ان تمام غیر قائم بالذات اشیا میں ضرور ایک ذات قائم بالذات ہے۔

مثال کے طور پر جسم کی حدود پر غور کرو (کہ) وہ کیا ہے، الجسم متحیز قابل البعاد الثلثہ [یعنی ہر جسم تین جہت رکھتا ہے (لمبائی، چوڑائی اور اونچائی)]۔ اس میں دو لفظ واقع ہیں۔ متحیز (اور) قابل البعاد۔ ذرا کہنا، قبول عرض ہے یا نہیں۔ جو قابل میں رہتا ہے بذاتہٖ قائم نہیں رہتا۔ حالاں کہ قبول کا لفظ جسم کی

تعریف میں ہے، جس کے جوہر ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تحیز {جگہ یا گھر} کا لفظ بھی اس حد میں پڑا ہے۔ تحیز بھی تو عرض ہے، متحیز میں رہتا ہے۔ خود قائم نہیں رہ سکتا۔ قبول و تحیز جسم کی حد میں پڑے ہیں۔ اس کے ذاتیات سے ہیں۔ عرض تو ذات اور ذاتیاتِ عین ہوتے ہیں، ایک ہوتے ہیں۔ تو جسم بھی عرض ہی ہوا۔ جس کا جزو غیر مستقل ہو، وہ غیر مستقل ہی ہو گا۔ اعراض تو لا یبقی فی زمانین ہیں (یعنی ان کا دو زمانے میں پایا جانا نہیں ہے)۔۔۔ اس کو جوہر فرض کریں تو لا یبقی فی زمانین بل فی الازمنۃ، یعنی اعراض کا دو زمانے میں پایا جانا لازم نہیں آتا بلکہ بہت سے زمانوں میں پایا جانا لازم آتا ہے۔ یہ لوگ خلقِ جدید کی وجہ سے شک میں پڑ گئے ہیں۔

اہل کشف و شہود دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر دَم تجلی فرماتا ہے۔ پھر اس کی تجلیات میں تکرار نہیں، عَود (پلٹ کر آنا) نہیں۔ وہ بچشم شہود دیکھتے ہیں کہ قہر احدیت کی تجلی مخلوقات کو فنا کر دیتی ہے۔ اور ہست کو نیست کر دیتی ہے۔ خلاق و رحمان کی تجلی، خلقِ جدید عطا کرتی اور پھر موجود کرتی ہے۔

دیکھو چراغ کا شعلہ قائم معلوم ہوتا ہے۔ حالاں کہ شعلے کے دھواں ہونے اور تیل کے شعلہ بننے کا سلسلہ برابر قائم ہے، مگر ایک آن کا شعلہ دوسری آن کے شعلے سے ملتا جلتا ہے۔ لہٰذا اِن کو سمجھنے میں غلط فہمی ہو رہی ہے۔

Siddiqui Publications